قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ، وَلَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ، وَلَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّھُمۡ صٰغِرُوۡنَ. (التوبہ ۹:۲۹)

''اِن (اہل کتاب) سے لڑو جو نہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں، نہ اللہ اور اُس کے رسول نے جو کچھ حرام ٹھیرایا ہے، اُسے حرام ٹھیراتے ہیں اور نہ دین حق کو اپنا دین بناتے ہیں۔ (اِن سے لڑو)، یہاں تک کہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں اور زیردست بن کر رہیں۔''

سورۂ توبہ کا یہ حکم اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت کی ایک فرع اور اُنھی اقوام کے ساتھ خاص تھا جن پر یہ حجت پوری کی گئی۔ اِس کے بعد اب دنیا کے کسی غیر مسلم سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

نظم حکومت

وَاَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ. (الشوریٰ ۴۲:۳۸)

''اور اُن کا نظام باہمی مشورے پر مبنی ہے۔''

اسلام کے قانون سیاست میں نظم حکومت کی اساس یہی آیت ہے۔ سورۂ شوریٰ میں تین لفظوں کا یہ جملہ اپنے اندر جو جہان معنی سمیٹے ہوئے ہے، اُس کی تفصیل یہ ہے:

اِس میں پہلا لفظ 'امر' ہے۔ عربی زبان میں یہ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، لیکن آیۂ زیر بحث میں اِس کا موقع و محل دلیل ہے کہ یہ نظام کے مفہوم میں ہے۔ یہ معنی اِس لفظ میں حکم ہی کے معنی میں وسعت سے پیدا ہوئے ہیں۔ حکم جب بہت سے لوگوں سے متعلق ہوتا ہے تو اپنے لیے حدود مقرر کرتا اور قواعد و ضوابط بناتا ہے۔ اُس وقت اِس کا اطلاق سیاسی اقتدار کے احکام اور جماعتی نظم، دونوں پر ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو لفظ نظام ہماری زبان میں اِسی مفہوم کی تعبیر کے لیے بولا جاتا ہے۔

پھر اِس مقام پر چونکہ قرآن مجید نے اِسے ضمیر غائب کی طرف اضافت کے سوا کسی دوسری صفت سے مخصوص نہیں کیا، اِس لیے نظام کا ہر پہلو اِس میں شامل سمجھا جائے گا۔ بلدیاتی مسائل، قومی و صوبائی امور، سیاسی و معاشرتی احکام، قانون سازی کے ضوابط، اختیارات کا سلب و تفویض، امرا کا عزل و نصب، اجتماعی زندگی کے لیے دین کی تعبیر، غرض نظام ریاست کے سارے معاملات اِس آیت میں بیان کیے گئے قاعدے سے متعلق ہوں گے۔ ریاست کا کوئی شعبہ اِس کے دائرے سے باہر اور کوئی حصہ اِس کے اثرات سے خالی نہ ہوگا۔

اِس کے بعد 'شوریٰ' ہے۔ یہ 'فعلیٰ' کے وزن پر مصدر ہے اور اِس کے معنی مشورہ کرنے کے ہیں۔ آیت زیر بحث

میں اِس کے خبر واقع ہونے سے جملے کا مفہوم اب وہ نہیں رہا جو 'شاورھم فی الامر فاذا عزمت فتو کل علی اللّٰہ'[ے] میں ہے۔ وہی بات کہنی مقصود ہوتی تو الفاظ غالباً یہ ہوتے: 'وفی الامر ھم یشاورون' (اور معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے)۔ اِس صورت میں ضروری تھا کہ معاشرہ امیر و مامور میں پہلے سے تقسیم ہو چکا ہوتا۔ امیر یا تو مامور من اللہ ہوتا یا قہر و تغلب سے اقتدار حاصل کر لیتا یا کوئی امام معصوم اُسے نامزد کر دیتا۔ بہر حال وہ کہیں سے بھی آتا اور کسی طرح بھی امارت کے منصب تک پہنچتا، صرف اِسی بات کا پابند ہوتا کہ قومی معاملات میں کوئی راے قائم کرنے سے پہلے لوگوں سے مشورہ کر لے۔ اجماع یا اکثریت کا فیصلہ تسلیم کر لینے کی پابندی اُس پر نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ راے کے رد و قبول کا اختیار اُسی کے پاس ہوتا۔ وہ چاہتا تو کسی کی راے قبول کر لیتا اور چاہتا تو بغیر کسی تردد کے اُسے رد کر دیتا۔

لیکن 'امرھم شوریٰ بینھم' کی صورت میں اسلوب میں جو تبدیلی ہوئی ہے، اُس کا تقاضا ہے کہ خود امیر کی امارت مشورے کے ذریعے سے منعقد ہو۔ نظام مشورے ہی سے وجود میں آئے۔ مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں۔ جو کچھ مشورے سے بنے، وہ مشورے سے توڑا بھی جا سکے۔ جس چیز کو وجود میں لانے کے لیے مشورہ لیا جائے، ہر شخص کی راے اُس کے وجود کا جز بنے۔ اجماع و اتفاق سے فیصلہ نہ ہو سکے تو فصل نزاعات کے لیے اکثریت کی راے قبول کر لی جائے۔

ہم اپنی زبان میں مثال کے طور پر یہ کہیں کہ: ''اِس مکان کی ملکیت کا فیصلہ اِن دس بھائیوں کے مشورے سے ہو گا'' تو اِس کے صاف معنی یہی ہوں گے کہ دس بھائی ہی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں اور اُن میں سے کسی کی راے کو دوسرے کی راے پر ترجیح حاصل نہیں ہے۔ وہ سب بالاتفاق ایک ہی نتیجے پر پہنچ جائیں تو خیر، ورنہ اُن کی اکثریت کی راے فیصلہ کن قرار پائے گی۔ لیکن یہی بات اگر اِس طرح کہی جائے کہ: ''مکان کی ملکیت کا فیصلہ کرتے وقت اِن دس بھائیوں سے مشورہ لیا جائے گا'' تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ فیصلہ کرنے کا اختیار اِن دس بھائیوں کو چھوڑ کر کسی اور شخص کے پاس ہے۔ اصل راے اُسے قائم کرنی ہے اور اُسی کی راے نافذ العمل ہو گی۔ راے قائم کرنے سے پہلے، البتہ اُسے چاہیے کہ اِن بھائیوں سے بھی مشورہ کرے۔ اِس صورت میں، ظاہر ہے کہ وہ اُن کے اجماع کا پابند ہو گا نہ اُن کی اکثریت کا فیصلہ قبول کرنا اُس کے لیے ضروری ہو گا۔

ہمارے نزدیک چونکہ مسلمانوں کے اجتماعی نظام کی اساس 'امرھم شوریٰ بینھم' ہے، اِس لیے اُن کے امرا و حکام کا انتخاب اور حکومت و امارت کا انعقاد مشورے ہی سے ہو گا اور امارت کا منصب سنبھال لینے کے بعد بھی وہ یہ اختیار نہیں رکھتے کہ اجتماعی معاملات میں مسلمانوں کے اجماع یا اکثریت کی راے کو رد کر دیں۔

صاحب ''تفہیم القرآن'' مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اِس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

[ے] آلِ عمران ۳:۱۵۹۔ ''نظم اجتماعی کے معاملے میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔ پھر جب کوئی فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسا کرو۔''

''امرھم شوریٰ بینھم' کا قاعدہ خود اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

اول یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں، اُنھیں اظہار راے کی پوری آزادی حاصل ہو اور وہ اِس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ اُن کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں اور اُنھیں اِس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اُس پر ٹوک سکیں، احتجاج کر سکیں اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور اُن کے ہاتھ پاؤں کس کر اور اُن کو بے خبر رکھ کر اُن کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بد دیانتی ہے، جسے کوئی شخص بھی 'امرھم شوریٰ بینھم' کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو، اُسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے اور یہ رضامندی اُن کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضامندی، درحقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقے سے کوشش کر کے اُس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جا سکتے جو دباؤ ڈال کر یا مال سے خرید کر یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق راے دیں اور اِس طرح کے اظہار راے کی اُنھیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر یا کسی جتھا بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف راے دیں، وہاں درحقیقت خیانت اور غداری ہوگی، نہ کہ 'امرھم شوریٰ بینھم' کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق راے) سے دیا جائے یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ: ''اُن کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے'' بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ: ''اُن کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں۔'' اِس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اِس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو، اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔''

(۵۰۹/۴۔۵۱۰)

قرآن مجید کا یہ اصول عقل و فطرت سے بھی ثابت ہے۔ مسلمانوں کا کوئی فرد معصوم نہیں ہوتا۔ علم و تقویٰ میں ہو سکتا ہے کہ وہ سب سے ممتاز ہو، امارت و خلافت کے لیے وہ احق ہو سکتا ہے اور اپنے کو احق سمجھ بھی سکتا ہے، لیکن جس طرح مجرد یہ

فضیلت اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی رائے کو نظر انداز کر کے خلافت کا منصب سنبھالنے کی کوشش کرے، اسی طرح مسلمانوں کے مشورے سے امارت کے منصب پر فائز ہو جانا بھی اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ اب وہ ہر خطا سے محفوظ ہے اور اسے یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی تنہا رائے کے مقابلے میں اہل الرائے کے اجماع یا ان کی اکثریت کی رائے کو رد کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل تھا اور اسی وجہ سے حاصل تھا کہ آپ فی الواقع ایک معصوم ہستی تھے، لیکن تاریخ وسیر کی کتابوں سے اس امر کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی کہ آپ نے کسی معاملے میں اپنی رائے کے مقابلے میں مسلمانوں کے اہل الرائے کی اکثریت کو نظر انداز کر دیا ہو۔

امیر بہر حال ایک فرد ہی ہوتا ہے اور فرد کی رائے کے مقابلے میں ہر شخص تسلیم کرے گا کہ ایک جماعت کی رائے میں صحت واصابت کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ امیر کو، اگر وہ فی الواقع ایک خدا ترس شخص ہے تو اپنی رائے کو وہی حیثیت دینی چاہیے جس کا اظہار فقہِ اسلامی کے ایک جلیل القدر امام نے اپنے اس قول میں کیا ہے کہ: ہم اپنی رائے کو صحیح کہتے ہیں، لیکن اس میں غلطی کا امکان تسلیم کرتے ہیں اور دوسروں کی رائے کو غلط کہتے ہیں، لیکن اس میں صحت کا امکان تسلیم کرتے ہیں۔

پھر یہ حقیقت ہے کہ مشورہ دینے والوں کو اگر اس بات کا احساس ہو کہ ان کے اجماع یا اکثریت کی رائے بھی ضروری نہیں کہ قبول کر لی جائے تو اول تو وہ مشورہ دینے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ طوعاً و کرہاً اس پر راضی بھی ہو گئے تو سخت بے دلی کے ساتھ مشورہ دیں گے۔ مسئلۂ زیرِ بحث کبھی ان کے غور وخوض کا حصہ نہ بن سکے گا۔ وہ شوریٰ میں کشاں کشاں لائے جائیں گے اور افسردہ خاطر ہو کر وہاں سے واپس ہو جائیں گے۔ سیاسی نظام اور ریاستی اداروں کے ساتھ ان کے دل ودماغ اور جذبات کا تعلق کبھی استوار نہ ہو سکے گا۔ قاضی ابوبکر جصاص نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں مشورہ دینے کے اس نفسیاتی پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

وغیر جائز ان یکون الامر بالمشاورة علی جهة تطییب نفوسهم، ورفع اقدارهم، ولتقتدی الامة به فی مثله، لانه لو کان معلوما عندهم فی استنباط ما شوو روا فیه، وصواب الرأی فیما سئلوا عنه، ثم لم یکن فی ذلك معمولاً علیه، ولا متلقی منه بالقبول بوجه، لم یکن فی ذلك تطییب نفوسهم ولا رفع لاقدارهم، بل فیه ایحاشهم واعلامهم بان اراءهم

''اور جائز نہیں ہے کہ مشورہ کرنے کا یہ حکم محض صحابہ کی دل داری اور ان کی عزت افزائی کے لیے ہو یا محض اس لیے ہو کہ اس طرح کے معاملات میں امت آپ کے طریقے کی پیروی کرے، حالاں کہ اگر صحابہ کو یہ معلوم ہوتا کہ جب وہ مشورہ طلب امور میں اپنے دل ودماغ کی ساری قوتیں کھپا کر کوئی رائے دیں گے تو اس پر نہ عمل ہو گا اور نہ کسی پہلو سے اس کی قدر کی جائے گی تو اس سے ان کی دل داری اور عزت افزائی تو کیا ہوتی، الٹا وہ متوحش ہوتے اور سمجھتے کہ ان کی رائیں نہ قبول کیے جانے کے لیے ہیں نہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

غیر مقبولة، ولا معمول علیها، فهذا تاویل ساقط لا معنی له فکیف یسوغ تاویل من تاوله لتقتدی به الامة، مع علم الامة عند هذا القائل بان هذه المشورة لم تفد شیئاً، ولم یعمل فیها بشیء اشاروا به. (۴۱/۲)

عمل کیے جانے کے لیے۔ لہٰذا احکام مشورہ کی یہ تاویل ناقابلِ اعتبار اور بے معنی ہے۔ پھر تاویل کا یہ پہلو کہ یہ حکم امت کو آپ کے طریقے کی تعلیم دینے کے لیے دیا گیا تھا، کس طرح درست ہو سکتا ہے، جب کہ کہنے والے کے نزدیک بھی یہ بات امت کے علم میں ہوگی کہ اس مشورے نے نہ کوئی فائدہ دیا اور نہ کسی معاملے میں اس کے مطابق عمل کیا گیا۔‘‘

یہاں ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف کارروائی اور لشکرِ اسامہ کی روانگی کے بارے میں سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کو اس کی تردید میں پیش کریں، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’(مانعینِ زکوٰۃ کے) اس واقعہ پر غور کرنے سے چند حقیقتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

ایک یہ کہ یہ معاملہ شوریٰ اور خلیفہ کے درمیان کا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ حضرت ابوبکر نے اس کو شوریٰ کے سامنے پیش ہی نہیں کیا تھا۔ شوریٰ کے سامنے وہ معاملات پیش ہوتے ہیں جو اجتہاد اور امورِ مصلحت سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ معاملہ دین کا ایک منصوص مسئلہ ہے۔ اسلامی حکومت میں کسی ایسی جماعت کے بحیثیتِ مسلم حقوقِ شہریت باقی ہی نہیں رہتے جو بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دے[8]۔ یہ چیز اسلامی قانون میں طے شدہ ہے۔ اس وجہ سے حضرت ابوبکر کی ذمہ داری یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو شوریٰ کے سامنے رکھتے، بلکہ بحیثیت خلیفہ ان کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ وہ اس بارے میں قانون کی تنفیذ کرتے۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ اسلامی حکومت کے حدود میں کوئی جماعت اگر قتل و غارت شروع کر دے تو خلیفہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس جماعت کی سرکوبی کے لیے شوریٰ سے اجازت طلب کرے، بلکہ اس کا فرض یہ ہے کہ قرآن نے محاربین کے لیے جو قانون بتایا ہے، اس کی تنفید کے لیے اپنے اختیارات بے دھڑک استعمال کرے۔

دوسری یہ کہ جن لوگوں نے امیر کے اس اقدام سے متعلق تردد کا اظہار کیا، ان کو ایک حدیث کے سمجھنے میں غلط فہمی ہو رہی تھی۔ حضرت ابوبکر نے اس حدیث کے اجمال کو ایک دوسری حدیث سے جو خود انھوں نے حضور سے سنی تھی، واضح کر دیا جس سے لوگ مطمئن ہو گئے[9]۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں کے نزدیک اس حدیث سے زیادہ وقیع حدیث اور کون سی ہو سکتی تھی

---

[8] اس کی تفصیل اوپر ’’شہریت اور اس کے حقوق‘‘ کے زیرِ عنوان ہم نے وضاحت کے ساتھ پیش کر دی ہے۔

[9] اور انھوں نے پھر کسی شوریٰ کے بلانے پر اصرار نہیں کیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جس کے راوی حضرت ابوبکر صدیق ہوں۔

تیسری یہ کہ حضرت ابوبکر نے یہ جو فرمایا کہ اگر ان لوگوں سے لڑنے کے لیے میں کسی کو نہیں پاؤں گا تو میں تنہا ان سے لڑوں گا، شوریٰ کے کسی فیصلے کو ویٹو کرنے والی بات نہیں ہے، بلکہ یہ اس ذمہ داری کا صحیح صحیح اظہار واعلان ہے جو دین کے واضح اور قطعی احکام کی تنفیذ اور ان کے اجرا سے متعلق بحیثیتِ خلیفہ اور پر عائد ہوتی تھی۔ اسلام میں خدا اور اس کے رسول کے احکام کی تنفیذ کے لیے خلیفہکی اصل ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ان کی تنفیذ کے لیے اپنی جان لڑا دے، اگرچہ ایک شخص بھی اس کا ساتھ نہ دے۔ جمہور کے مشوروں کا پابند وہ مصلحتی اور اجتہادی امور میں ہے نہ کہ شریعت کی قطعیات میں۔

اسی طرح لشکرِ اسامہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی ساری تیاریاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضور کی حیاتِ مبارک ہی میں ہو چکی تھیں۔ اس کے لیے اشخاص بھی حضور کے منتخب کردہ تھے۔ اس کے لیے جھنڈا بھی خود حضور نے باندھا تھا، یہاں تک کہ اگر حضور کی علالت نے تشویش انگیز شکل نہ اختیار کر لی ہوتی تو یہ لشکر روانہ ہو چکا تھا۔ اسی دوران میں حضور کا وصال ہو گیا اور حضور کے بعد حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے خلیفہ ہونے کے بعد قدرتی طور پر اپنی سب سے بڑی ذمہ داری یہ سمجھی کہ حضور جس لشکر کے بھیجنے کی ساری تیاریاں اپنے سامنے کر چکے تھے اور جس کے جلد سے جلد بھیجنے کے دل سے آرزومند تھے۔ اس لشکر کو اس کی پیشِ نظر مہم پر روانہ کر دیں۔ بحیثیت خلیفۂ رسول کے ان کی سب سے بڑی ذمہ داری اور ان کے لیے سب سے بڑی سعادت اس وقت کوئی ہو سکتی تھی تو بلا ریب یہی ہو سکتی تھی کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کو پورا کریں۔ اس کام کے لیے وہ شوریٰ سے مشورہ کے محتاج نہ تھے، کیونکہ اس لشکر کے بھیجنے کے فیصلہ سے متعلق سارے امور خود حضور کے سامنے، بلکہ خود حضور کے حکم سے طے پا چکے تھے۔ پیغمبر کے خلیفہ کی حیثیت سے، ان کا کام پیغمبر کے فیصلہ کو نافذ کرنا تھا نہ کہ اس کو بدل دینا۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے جب وقت کے مخصوص حالات کی بنا پر اس لشکر کو خلافِ مصلحت قرار دیا تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس جھنڈے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا ہے، میں اس کو کھولنے کے لیے تیار نہیں۔

بہرحال، یہ دونوں واقعے کسی طرح بھی اس بات کی دلیل نہیں بن سکتے کہ خلیفہ کو شوریٰ کے فیصلے رد کر دینے کا حق ہے۔ یہ اگر دلیل ہیں تو اس بات کی دلیل ہیں کہ خدا اور رسول کے قطعی احکام کی تنفیذ کے معاملے میں خلیفہ شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا پابند نہیں ہے، بلکہ اس کی ذمہ داری صرف ان احکام کی تنفیذ ہے۔'' (اسلامی ریاست ۳۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین نے اپنے تمدن کے لحاظ سے 'امرھم شوریٰ بینھم' کے اس قرآنی اصول کے مطابق نظمِ اجتماعی میں عام مسلمانوں کی شرکت کا جو طریقہ اپنے زمانے میں اختیار فرمایا، اس کی تفصیلات یہ ہیں۔

اولاً، یہ اصول قائم کیا گیا کہ مسلمان اپنے معتمد لیڈروں کی وساطت سے شریکِ مشورہ ہوں گے۔ بخاری میں ہے:

www.javedahmadghamidi.com

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال حين اذن الهم المسلمون فى عتق سبى هوازن، فقال: انى لا ادرى من اذن فيكم ممن لم ياذن، فارجعوا احتى يرفع الينا عرفاء كم امر كم. (رقم ٦٧١٧)

''مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق جب ہوازن کے قیدی رہا کرنے کی اجازت دی تو آپ نے فرمایا: میں نہیں جان سکا کہ تم میں سے کس نے اجازت دی ہے اور کس نے نہیں دی۔ پس تم جاؤ اور اپنے لیڈروں کو بھیجو تاکہ وہ تمھاری رائے سے ہمیں آگاہ کریں۔''

سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں دارمی کی روایت ہے:

فان اعياه ان يجد فيه سنة من رسول الله صلى الله عليه وسلم، جمع رؤس الناس وخيارهم، فاستشار هم۔ فاذا اجتمع رايهم على امرقضى به. (۵۳)

''پھر اس معاملے میں اگر انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت نہ ملتی تو قوم کے اعیان و اکابر کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جب وہ کسی بات پر جم جاتے تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یہ حیثیت قبائل کے سرداروں کو حاصل تھی۔ اوس و خزرج اور قریش کے سردار لفظ کے ہر مفہوم میں ان قبائل کے معتمد تھے۔ بے شک، یہ منصب ان کو انتخابات کے ذریعے سے حاصل نہیں ہوا تھا اور اس زمانے کے تمدنی حالات میں اس کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگ ان حضرات کے سماجی مقام اور فہم و تجربہ کی وجہ سے سیاسی و اجتماعی معاملات میں انھی کو مرجع بناتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی انھیں یہ اعتماد ان کے قبائل کی آزادانہ مرضی سے حاصل تھا اور اسلام لانے کے بعد بھی ان کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ اسلام سے قبل تو کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ جبر و استبداد سے اولوالامر بن بیٹھے تھے، لیکن اسلام لانے کے بعد اس کا کوئی امکان نہ تھا۔ ان کے اتباع و عوام جب چاہتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان پر عدم اعتماد کا اظہار کر سکتے تھے۔ اور اگر وہ ایسا کرتے تو یہ حضرات یقیناً اس منصب پر برقرار نہ رہ سکتے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں تمام اہم فیصلے انھی سرداروں کے مشورے سے کیے اور خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی اربابِ حل و عقد کی حیثیت سے ان کا یہ مقام اسی طرح برقرار رہا۔

سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عراق و شام کی زمینوں کے بارے میں ایک شوریٰ کے انعقاد کا حال بیان کرتے ہوئے قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں:

قالوا: فاستشر، قال: فاستشار المهاجرين الاولين فاختلفوا، فاما عبد

''لوگوں نے کہا: تو پھر آپ باقاعدہ مشورہ کیجیے۔ اس پر آپ نے مہاجرینِ اولین سے مشورہ کیا تو ان کی رایوں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الرحمن بن عوف رضى الله عنه فكان رأيه ان تقسم لهم حقوقهم، ورأى عثمان و على وطلحة و ابن عمر رضى الله عنهم رأى عمر، فارسل الى عشرة من الانصار: خمسة من الاوس وخمسة من الخزرج، من كبرائهم واشرفهم.

(کتاب الخراج ۲۷)

میں بھی اختلاف تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف کی رائے تھی کہ ان لوگوں کے حقوق انھی میں تقسیم کر دینے چاہییں اور عثمان، علی، طلحہ اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہم حضرت عمر سے متفق تھے۔ پھر آپ نے انصار میں سے دس افراد کو بلایا۔ پانچ اوس کے اکابر واشراف میں سے اور پانچ خزرج کے اکابر و اشراف میں سے۔''

اہل شوریٰ کے مقابلے میں اپنی حیثیت سیدنا عمر نے اس مجلس میں اس طرح واضح فرمائی:

انی لم ازعجکم الا لان تشترکوافی امانتی فیما حملت من امورکم، فانی واحد کاحد کم... ولست اریدان تتبعوا هذا الذی هوای. (کتاب الخراج ۲۷)

''میں نے آپ لوگوں کو اس لیے زحمت دی ہے کہ آپ کے معاملات کا جو بارِ امانت مجھ پر ڈالا گیا ہے، اس کے اٹھانے میں آپ میری مدد کریں۔ میں آپ ہی جیسا ایک شخص ہوں ...اور نہیں چاہتا کہ آپ ان معاملات میں میری خواہش کی پیروی کریں۔''

اس طرح کی مجالس کے انعقاد کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک منادی اعلان کرتا کہ 'الصلوة جامعة ' یعنی لوگ نماز کے لیے جمع ہو جائیں۔ جب لوگ جمع ہو جاتے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ دو رکعت نماز پڑھتے، پھر ایک مختصر تقریر فرماتے اور جس معاملے پر رائے لینا مقصود ہوتی، اسے بحث کے لیے پیش کر دیتے۔ عراق وشام کی زمینوں کا معاملہ اور معرکۂ نہاوند کے موقع پر خود امیر المومنین کے میدانِ جنگ میں جانے کا مسئلہ انھی مجالس میں طے ہوا۔ اسی طرح فوج کی تنخواہ، عمال کے تقرر، دفتر کی ترتیب، غیر قوموں کے لیے تجارت کی آزادی اور ان سے متعلق محاصل وغیرہ کے معاملات بھی انھی مجالس میں پیش ہو کر طے پائے۔ طبقات ابنِ سعد، کنز العمال، تاریخِ طبری، کتاب الخراج اور اس طرح کی بعض دوسری کتابوں میں ان کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ روزانہ انتظامات کے لیے خاص برسرِ اقتدار جماعت کے اعیان و اکابر پر مشتمل ایک اور مجلس بھی تھی جس کے اجلاس مسجدِ نبوی میں منعقد ہوتے رہتے تھے:

کان للمهاجرين مجلس فی المسجد. فكان عمر يجلس معهم فيه، ويحدثهم عما ينتهی اليه من امور الآفاق.

(فتوح البلدان ۲۶۶)

''مسجد نبوی میں مہاجرین کی ایک مجلس منعقد ہوتی تھی اور حضرت عمر اس میں بیٹھتے اور اس کے سامنے وہ تمام حالات پیش کیا کرتے تھے جو مملکت کے مختلف گوشوں سے ان کو پہنچے تھے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ثانیاً، یہ روایت قائم کی گئی کہ امامت و سیاست کا منصب ریاست میں موجود مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں سے اس گروہ کا استحقاق قرار پائے گا جسے عام مسلمانوں کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہوگا۔

رسول اللہ نے صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے یہ فرمایا کہ حکومت کے لیے آپ کے جانشین آپ کے بعد انصار کے بجائے قریش ہوں گے۔ آپ نے فرمایا:

ان ھذا الامر فی قریش ، لا یعادیھم احد الا کبہ اللہ فی النار علی وجھہ ما اقاموا الدین. (بخاری، رقم ۷۱۳۹)

''ہمارا یہ اقتدار قریش کو منتقل ہو جائے گا، جب تک وہ دین پر قائم رہیں۔ اِس معاملے میں جو شخص بھی اُن کی مخالفت کرے گا، اللہ اُسے اوندھے منہ آگ میں ڈال دے گا۔''

چنانچہ انصار کو آپ نے ہدایت کی کہ 'قدموا قریشاً و لا تقدموھا'[۱۰] (اس معاملے میں قریش کو آگے کرو اور ان سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو) اپنے اِس فیصلے کی وجہ یہ بیان فرمائی:

الناس تبع لقریش فی ھذا الشان، مسلمھم لمسلمھم، و کافرھم لکافرھم. (مسلم، رقم ۱۸۱۸)

''لوگ اِس معاملے میں قریش کے تابع ہیں۔ عرب کے مومن اُن کے مومنوں کے پیرو ہیں اور اُن کے کافر اُن کے کافروں کے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اِس طرح یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل واضح کر دی کہ عرب کے مسلمانوں کا اعتماد چونکہ قریش کو حاصل ہے، اِس لیے قرآن مجید کی ہدایت —— امرھم شوریٰ بینھم —— کی روشنی میں امامت عامہ کا مستحق پورے عرب میں اُن کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور انتقال اقتدار کا یہ فیصلہ کسی نسبی تفوق یا نسلی ترجیح کی بنا پر نہیں، بلکہ اُن کی اِس حیثیت ہی کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

تاریخِ عرب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں سیاسی اقتدار اسی گروہِ قریش کو حاصل تھا اور انھی کے اشراف عرب کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ بدر و احد کے معرکوں میں ان لیڈروں کی بڑی اکثریت اگرچہ تلوار کے گھاٹ اتار دی گئی تھی، لیکن بحیثیتِ جماعت عربوں کا اعتماد اب بھی قریش ہی کو حاصل تھا۔ ان میں سے جو بڑے بڑے لوگ ایمان لائے وہ سب مدینہ میں جمع تھے اور بہت سے لوگوں کو ان کی اسلامی خدمات نے دوسروں سے ممتاز کر دیا تھا۔ یہی لوگ تھے جن کے لیے مہاجرین کا اصطلاحی نام استعمال ہوتا تھا اور عام عربوں کے قبولِ اسلام کے بعد ان کے لیڈر اب مسلمانوں میں اسی اعتماد و رسوخ کے حامل تھے جو زمانۂ جاہلیت میں قریش کے اعیان و اکابر کو حاصل ہوا کرتا تھا۔ اس وجہ

---

[۱۰] تلخیص الحبیر ۲/ ۶۲۔

سے یہ حقیقت اپنے اثبات کے لیے انتخابات کی محتاج تھی نہ اس کے بارے میں کسی اختلاف ونزاع کی گنجایش تھی کہ عرب کے عام مسلمانوں کا اعتماد بہر حال قریش کو حاصل ہے اور جزیرہ نما میں کوئی دوسرا گروہ انھیں چیلنج کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ مدینہ طیبہ میں اوس وخزرج کے لیڈروں ـــــ سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ ـــــ کی قیادت میں مقامی طور پر انصار کا اثر و رسوخ مسلم تھا۔ اپنی دینی خدمات کے اعتبار سے یہ مہاجرینِ قریش سے کسی طرح کم نہ تھے۔ اُنھوں نے ہجرت کی تھی تو انھوں نے غیر مشروط حمایت ونصرت کی پیش کش کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا۔ بدر واحد اور احزاب وحنین کے معرکوں میں یہ اُن کے پہلو بہ پہلو اسلام کے دشمنوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ مؤاخات کے زمانے میں انفاق فی سبیل اللہ کی جو مثال انھوں نے قائم کی تھی، تاریخ کے اوراق سے اس کی کوئی نظیر پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ اسلامی ریاست اگر مدینہ ہی کے حدود میں رہتی تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اقتدار ان کی طرف منتقل ہو جاتا، لیکن فتحِ مکہ کے بعد عام عربوں کے اسلام کی طرف رجوع نے سیاسی صورتِ حال میں عظیم تغیر پیدا کر دیا اور مہاجرین قریش کے مقابلے میں انصار کے سیاسی اثر و رسوخ کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی۔

تاہم اس کے باوجود اندیشہ تھا کہ قبائلی حمیت کا جائز اور فطری رجحان، دینی خدمات میں مسابقت کا جذبہ اور مدینہ طیبہ میں اپنی حمیت اور اثر و رسوخ پر اعتماد کہیں انھیں اقتدار کی کش مکش میں مبتلا نہ کر دے اور وہ مہاجرین قریش کو چیلنج کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ یہ صورت حال اگر خدانخواستہ پیدا ہو جاتی تو منافقین اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے اور اس وقت کے تمدنی حالات میں جنگ وجدال کے سوا فصل نزاع کی کوئی صورت تلاش کرنا ناممکن ہو جاتا۔

چنانچہ اسی اندیشے کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل میں متوقع اس قضیے کو اپنی زندگی ہی میں ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور رئیسِ انصار سعد بن عبادہ کی موجودگی میں لوگوں، بالخصوص انصار پر واضح کر دیا کہ 'الائمة من قریش'[11] (میرے بعد امامت قریش کو منتقل ہو جائے گی)۔ لہٰذا سقیفہ بنی ساعدہ میں جب انصار کے لیڈروں نے حکومت کے لیے اپنا استحقاق ثابت کرنے کی غرض سے پر جوش تقریریں کیں تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی فیصلے کا حوالہ دیا۔ آپ نے فرمایا:

لقد علمت یا سعد، ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم قال و انت قاعد، قریش ولاة هذا الامر، فبر الناس تبع لبرهم وفاجرهم تبع لفاجرهم، فقال له سعد: صدقت، نحن الوزراء وانتم الامراء.	''اے سعد، تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھارے سامنے یہ بات فرمائی تھی کہ حکومت قریش کو ملے گی، اس لیے کہ عرب کے اچھے اُن کے اچھوں کے پیرو ہیں اور ان کے برے ان کے بروں کے۔ سعد نے جواب دیا: آپ نے ٹھیک کہا، ہم وزیر ہیں

---

[11] احمد بن حنبل، رقم ۱۲۴۸۹۔

(احمد بن حنبل، رقم ۱۹)   اور آپ امیر۔''

ایک دوسری روایت میں ان کے الفاظ ہیں:

العرب لا تعرف هذا الامر الالهذ الحی من قریش. (احمد بن حنبل، رقم ۳۹۳)

''اہل عرب اس قبیلۂ قریش کے سوا کسی اور کی قیادت سے آشنا نہیں ہیں۔''

رئیس انصار سعد بن عبادہ کی طرف سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی تصدیق کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ کے حاضرین پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بحث وتمحیص کی گرما گرمی میں وہ غلط راستے پر چل پڑے تھے، دراں حالیکہ ان کے غور کرنے کا مسئلہ صرف یہ تھا کہ عام مسلمانوں کی اکثریت کے اعتماد کی بنا پر جس گروہ کو اقتدار منتقل ہوا ہے، اس کی قیادت کے لیے کس لیڈر کا انتخاب کیا جائے۔ وہ اس کے رہنماؤں میں سے جسے منتخب کریں گے، وہی مسلمانوں کا حکمران ہوگا اور ان پر اس کی اطاعت واجب ہوگی۔ انتقال اقتدار کا یہ فیصلہ ان کے رسول نے کیا ہے اور اس کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔

خلافتِ راشدہ اسی فیصلے کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ انصار کے اکابر نے جب اسے تسلیم کر لیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے اس یقین کی بنا پر کہ مہاجرینِ قریش کے لیڈر ان کی رائے سے نہ صرف یہ کہ اختلاف نہ کریں گے، بلکہ سقیفہ کی صورت حال میں ان کے اقدام کو لازماً درست قرار دیں گے۔ صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ بعد میں ایک موقع پر انھوں نے کود اپنے اس اقدام کا یہی سبب بیان فرمایا اور لوگوں کو تنبیہ کی کہ آیندہ کوئی شخص اسے اس باب میں قرآن مجید کے حکم —— امرهم شوریٰ بینهم —— کی خلاف ورزی کے لیے دلیل کے طور پر پیش کرنے کی جسارت نہ کرے۔ انھوں نے فرمایا:

فلا یغترن امرؤ ان یقول: انما کانت بیعة ابی بکر فلتة وتمت، الا، وانها قد کانت کذلك، ولکن الله وقی شرها، ولیس فیکم من تقطع الاعناق الیه مثل ابی بکر۔ من بایع رجلاً من غیر مشورة من المسلمین فلا یبایع هو ولا الذی بایعه تغرة ان یقتلا۔ (بخاری، رقم ۶۸۳۰)

''تم میں سے کوئی شخص اس بات سے دھوکا نہ کھائے کہ ابوبکر کی بیعت اچانک ہوئی اور لوگوں نے اسے قبول کر لیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی بیعت اسی طرح ہوئی، لیکن اللہ نے اہل ایمان کو اس کے کسی برے نتیجے سے محفوظ رکھا اور یاد رکھو، تمھارے اندر اب کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ ابوبکر کی طرح جس کے سامنے گردنیں جھک جائیں۔ لہٰذا جس شخص نے اہلِ ایمان کی رائے کے بغیر کسی کی بیعت کی، اس کی اور اس سے بیعت لینے والے، دونوں کی بیعت نہ کی جائے۔ اس لیے کہ اپنے اس اقدام سے وہ گویا اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کریں گے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت بھی مہاجرینِ قریش کی یہ حیثیت برقرار تھی۔ انصار یا عرب کے کسی دوسرے گروہ نے چونکہ ان کے مقابلے میں اکثریت کا اعتماد حاصل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا، اس لیے اقتدار بدستور ان کے پاس تھا اور اس کی توثیق کے لیے عام مسلمانوں کی طرف رجوع کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ نئے امیر المومنین کی حیثیت سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو مہاجرین قریش کے لیڈر نے نامزد کیا اور ان کے اس انتخاب کو مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں ــــ انصار مہاجرین ــــ کے لیڈروں نے قبول کر لیا تو بغیر کسی انزاع کے، اسلامی دستور کے عین مطابق، امارت ان کی طرف منتقل ہو گئی۔ ابن سعد کی روایت ہے:

ان ابابکر الصدیق لما استعزبه، دعا عبد الرحمن ابن عوف فقال: اخبر نی عن عمر بن الخطاب، فقال عبدالرحمن: ما تسألنی عن امر الا و نت اعلم به منی، فقال ابوبکر: و ان، فقال عبدالرحمن: هو، واللّٰه افضل من رأيك فيه، ثم دعا عثمان بن عفان، فقال: اخبرنی عن عمر، فقال: انت اخبرنا به، فقال عثمان: اللّٰهم علمی به ان سریرته خیر من علانیته، و انه لیس فینا مثله. (الطبقات الکبریٰ ۳/ ۱۹۹)

''ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر بیماری نے غلبہ پالیا اور ان کی وفات کا وقت قریب آ گیا تو انھوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو بلایا اور ان سے کہا: مجھے عمر بن الخطاب کے بارے میں بتاؤ۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: آپ مجھ سے ایک ایسے معاملے کے بارے میں رائے چاہتے ہیں جسے آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ ابوبکر نے فرمایا: اگرچہ (یہ درست ہے، لیکن تم اپنی رائے دو)۔ اس پر عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا: خدا کی قسم، وہ اس رائے سے بھی بڑھ کر ہیں جو آپ ان کے بارے میں رکھتے ہیں۔ پھر انھوں نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو طلب کیا اور ان سے کہا: مجھے عمر کے بارے میں بتاؤ۔ حضرت عثمان نے جواب دیا: ہم سے زیادہ آپ انھیں جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس کے باوجود، اے ابوعبداللہ، (میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں)۔ اس پر حضرت عثمان نے کہا: بے شک، میں تو یہ جانتا ہوں کہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہتر ہے اور ان جیسا ہمارے اندر کوئی دوسرا نہیں ہے۔''

ابن سعد بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ان دونوں کے علاوہ مہاجرین و انصار کے تمام بڑے بڑے لیڈروں سے مشورہ کیا:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وشاور معهما سعيد بن زيد ابا الاعورو اسيد بن الحضيرو غيرهما من المهاجرين والانصار فقال اسيد: اللهم، اعلمه الخيرة بعدك، يرضى للرضى و يسخط للسخط، الذى يسر خير من الذى يعلن، ولم يل هذا الامر احد اقوى عليه منه. (الطبقات الکبریٰ ۳/ ۱۹۹)

''اور انھوں نے ان دونوں حضرات کے ساتھ ابوالاعور سعید بن زید، اسید بن الحضیر اور ان کے علاوہ مہاجرین و انصار کے دوسرے لیڈروں سے بھی مشورہ کیا تو اسید نے کہا: بے شک، میں انھیں، اے ابوبکر، آپ کے بعد سب سے بہتر سمجھتا ہوں۔ وہ خوشی کے موقع پر خوش اور ناراضی کے موقع پر ناراض ہوتے ہیں۔ ان کا پوشیدہ ان کے ظاہر سے بہتر ہے۔ اس خلافت کا بوجھ ان سے بڑھ کر کوئی نہیں اٹھا سکتا۔''

اس کے بعد ابن سعد نے بتایا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت ابوبکر کی رائے سے اختلاف بھی کیا، لیکن انھوں نے انھیں مطمئن کر دیا۔ پھر حضرت عثمان کو بلایا اور کہا:

اكتب: بسم الله الرحمن الرحيم۔ هذا ما عهد ابوبكر بن ابى قحافة اخر عهده بالدنيا خارجاً منها، وعند اول عهده بالاخرة داخلاً فيها، حيث يؤمن الكافر، ويوقن الفاجر، ويصدق الكاذب، انى استخلفت عليكم بعدى عمر بن الخطاب، فاسمعوا له واطيعوا.

(الطبقات الکبریٰ ۳/ ۲۰۰)

''لکھیے: اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے۔ یہ ابوبکر بن ابی قحافہ کی وصیت ہے جو اس نے دنیوی زندگی کے اختتام پر، جب وہ اس سے نکلنے کو ہیں اور اخروی زندگی کے آغاز پر، جب وہ اس میں داخل ہونے کو ہیں، اس وقت کی ہے، جب کافر ایمان لاتے، فاجر یقین کرتے اور جھوٹے سچ بولتے ہیں۔ میں نے عمر بن الخطاب کو تمھارا خلیفہ بنایا ہے۔ پس ان کی سنو اور اطاعت کرو۔''

ان کے اس خط پر مہر لگائی گئی، ان کے حکم کے مطابق عمر بن الخطاب اور اسید بن سعید کی معیت میں حضرت عثمان اسے لے کر باہر تشریف لائے اور لوگوں سے کہا:

اتبايعون لمن فى هذا الكتب؟ فقالوا: نعم. (الطبقات الکبریٰ ۳/ ۲۰۰)

''اس خط میں جس کے حق میں وصیت کی گئی ہے، تم اس کی بیعت کرو گے؟ لوگوں نے کہا: ہاں۔''

ابن سعد کی روایت ہے:

فاقروا بذلك جميعاً، ورضوا به، و بايعوا، ثم دعا ابو بكر عمر خالياً، فاوصاه بما

''سب نے اقرار کیا اور اس پر راضی ہوئے اور عمر کی بیعت کی۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر کو خلوت میں بلایا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

او صاه به۔ (الطبقات الکبریٰ ۳/۲۰۰)
اور جو نصیحت کرنا چاہی، کی۔''

عمر رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے اور رخصت کا وقت قریب آ گیا، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہی کہ عام مسلمانوں کی اکثریت کا اعتماد ابھی تک مہاجرین قریش ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ اسلامی دستور کی رو سے مسئلہ کی نوعیت اس وقت بھی یہی تھی کہ اکثریتی گروہ کو اپنے نئے لیڈر کا انتخاب کرنا تھا۔ ذمہ دار لوگوں نے خود عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ: 'الا تعهد الینا، الا تو مر علینه'[۱۲]، (کیا آپ ہمارے لیے وصیت نہیں کریں گے، کیا آپ ہمارے لیے خلیفہ مقرر نہیں فرمائیں گے)؟ لیکن انھوں نے حضرت ابو بکر کی طرح ارکان شوریٰ کے مشورے سے خود کسی خلیفہ کا تقرر کرنے کے بجائے یہ معاملہ مہاجرینِ قریش کے چھ بڑے لیڈروں کے سپرد کر دیا اور ان سے کہا:

انی قد نظرت لکم فی امر الناس فلم اجد عند الناس، شقاقاً الا ان یکون فیکم، فان کان شقاق فھو فیکم وانما الامر الی ستة: الی عبد الرحمن و عثمان وعلی الزبیر وطلحة وسعد. (الطبقات الکبریٰ ۳/۳۴۴)

''میں نے تمھارے لیے امامت عامہ کے مسئلہ پر غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خلافت کے معاملے میں لوگوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ الّا یہ کہ وہ تم میں ہو۔ پس اگر کوئی اختلاف ہے تو وہ تمھارے اندر ہی محصور ہے، لہٰذا اب یہ معاملہ تم چھ اصحاب عبدالرحمن، عثمان، علی زبیر، طلحہ اور سعد کے سپرد ہے۔''

ان کی اس بات کا مطلب یہ تھا کہ امارت کے لیے چونکہ لوگوں کی نظروں میں تمھارے سوا کوئی اور نہیں ہے، اس لیے تم لوگ اگر اپنے میں سے کسی ایک پر متفق ہو جاؤ گے تو وہ تمھارے اس فیصلے سے اختلاف نہ کریں گے۔

اس کے بعد انھوں نے فرمایا: 'قوموا فتشاوروا فامروا احدکم'[۱۳] (اٹھو، مشورہ کرو اور اپنے میں سے کسی کو امیر بنا لو)۔ تاہم چونکہ اندیشہ تھا کہ شر پسند شورش برپا کرنے کی کوشش کریں یا یہ حضرات مشاورت کو ضرورت سے زیادہ طویل کر دیں، اس لیے آپ نے انصار کو جو اقلیتی گروہ ہونے کی وجہ سے اس قضیے سے الگ تھے، ان پر نگران مقرر کر دیا۔ ابنِ سعد انس بن مالک کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

ارسل عمر بن الخطاب الی ابی طلحة الانصاری قبل ان یموت بساعة فقال: یا ابا طلحة، کن فی خمسین من قومك من الانصار مع ھولاء النفر: اصحاب

''عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے وفات سے ذرا پہلے ابو طلحہ انصاری کو بلایا۔ وہ آئے تو فرمایا: ابو طلحہ، اپنی قوم، انصار کے پچاس آدمی لے کر ان اصحاب شوریٰ کے پاس پہنچ جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ یہ اپنے میں سے کسی کے گھر پر

۱۲؎ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۳/۳۴۳۔

۱۳؎ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۳/۳۴۴۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الشوریٰ، فالنهم فیما احسب سیجتمعون فی بیت احد هم، فقم علی ذلك الباب باصحابك، فلا تترك احداً یدخل علیهم، ولا تترکهم یمضی الیوم الثالث حتی یومروا احد هم.

(الطبقات الکبریٰ ۳/۳۶۴)

جمع ہوں گے۔ لہٰذا تم اپنے ساتھیوں کو لے کر دروازے پر کھڑے ہو جاؤ اور نہ کسی کو اندر داخل ہونے دو، نہ انھیں انتخاب امارت کے لیے تین دن سے زیادہ کی مہلت دو۔''

انصار کے اربابِ حل وعقد کے بارے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو ہدایت کی کہ:

احضروا معکم من شیوخ الانصار، ولیس لهم من امرکم من شئی.

(الامامۃ والسیاسۃ، ابن قتیبہ ۲۸)

''انصار کے لیڈروں کو اپنے ساتھ بلا لو، لیکن تمھاری اس امارت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔''

ابن سعد کی روایت ہے کہ یہ سب جمع ہوئے تو عبدالرحمٰن بن عوف نے ان میں سے تین کو تین کے حق میں دست بردار ہونے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ زبیر علی کے حق میں اور طلحہ وسعد، عثمان اور عبدالرحمٰن کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ پھر انھوں نے علی وعثمان سے کہا کہ وہ اس معاملے کا فیصلہ ان کے سپرد کر دیں۔ وہ دونوں راضی ہو گئے تو علی رضی اللہ عنہ سے کہا:

ان لك من القرابة من رسول الله صلی اللّٰه علیه وسلم والقدم، والله علیك لئن استخلفت لتعدلن، ولئن استخلف عثمان لتسمعن ولتطیعن.

(الطبقات الکبریٰ ۳/ ۳۳۹)

''تمھیں دین میں سبقت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کا شرف حاصل ہے۔ خدا گواہ رہے کہ اگر خلافت تمھارے سپرد ہوئی تو وعدہ کرو کہ عدل کرو گے اور اگر عثمان خلیفہ بنا دیے گئے تو ان کے ساتھ سمع وطاعت کا رویہ اختیار کرو گے۔''

حضرت علی نے اقرار کیا تو انھوں نے یہی بات عثمان رضی اللہ عنہ سے کہی۔ وہ بھی راضی ہو گئے تو فرمایا: عثمان اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔ انھوں نے ہاتھ بڑھایا تو حضرت علی اور دوسرے لوگوں نے بیعت کر لی۔[14]

علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن یہ اختلاف آرا کسی بنیادی اصول کے بارے میں نہیں، صرف اس بات میں ہے کہ قریش کے سب لیڈر کیا ان کے انتخاب کے موقع پر جمع ہوئے اور ان کا انتخاب کیا انھوں نے اپنی آزادانہ مرضی سے کیا یا اس میں جبر و اکراہ کو بھی کچھ دخل تھا؟ یہ بحث ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے، اس لیے اس سے قطعِ نظر بھی کر لیا جائے تو یہ حقیقت اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ خلافتِ راشدہ کے پورے دور میں اقتدار بہر حال اکثریتی گروہ،

۱۴؎ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۳/ ۳۳۹۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یعنی مہاجرین قریش کے پاس رہا اور ان کے بڑے بڑے لیڈر باہمی مشورے سے امامتِ عامہ کے لیے مختلف اشخاص کا انتخاب کرتے رہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ چاروں خلفاء کے انتخاب کے لیے الگ الگ طریقے اختیار نہیں کیے گئے، بلکہ اصولی اعتبار سے ایک ہی طریقے کی پیروی کی گئی۔ یہ سب اکثریتی گروہ کے اکابر میں سے منتخب کیے گئے اور ان کا انتخاب تمام گروہوں کے اکابر کے مشورے سے ہوا۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ پر وہ متفق ہو گئے تو حضرت ابوبکر نے ان کا فیصلہ خود نافذ کر دیا اور حضرت عمر نے ان کی رائے کو مختلف، لیکن چھ بڑے لیڈروں ہی میں محصور پایا تو ان کے اس فیصلے کا اعلان خود کر دیا اور ان چھ میں سے ایک کے انتخاب کی ذمہ داری خود ان چھ اشخاص پر ڈال دی۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com